طبع کے ساتھ ساتھ ضیافت ''شکم'' کا سامان بھی مہیا ہوتا ۔ ان صحبتوں میں ان کی شخصیت کے دو غیر معمولی راز کھلتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی کی دولت سے بڑی حد تک بہرہ ور ہیں ۔ دوسرا یہ کہ وہ کھانے اور کھلانے کے فن لطیف میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں ۔ انھیں دسترخوان بچھانے اور اس پر الوان نعمت چننے سے بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی ۔ اس مسرت کا بہترین موقع وہ ہوتا تھا جب وہ اپنے شاگردوں کو اپنے خوان یغما پر جمع کرتے اور ان کی معصوم گستاخیوں اور پسندیدہ دراز دستیوں کا تماشا دیکھتے ۔ اقبال صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یورپ میں غیر رسمی تدریس رسمی تدریس سے زیادہ مفید سمجھی جاتی ہے ۔ چنانچہ وہ اکثر پروفیسر براؤن کی ان غیر رسمی صحبتوں کا ذکر کیا کرتے تھے جن میں موصوف اپنے شاگردوں کے سامنے مفید معلومات کے دریا بہا دیتے تھے مگر ایسے عمدہ پیرائے میں کہ سننے والے کو ذرا بھی دل تنگی محسوس نہ ہوتی تھی ۔ بلاشبہ تدریس کا یہ رنگ بڑا دل پسند ہے مگر میری بدگمانی یہ ہے کہ مغرب کے اساتذہ کے لیے شاید یہ ممکن نہ ہوتا ہوگا کہ ''مالی منصوبہ بندی'' کے ماتحت (جو مغرب میں مروج ہے) وہ اس دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوں جس کا مظاہرہ پروفیسر اقبال کے مکان پر ہوا کرتا تھا ۔ معمولی رسمی تواضع کی اور بات ہے مگر آئین مہانداری کے معاملے میں مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ۔ مشرق اور مغرب کی یہ ہم قدمی بظاہر قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی ۔

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ اقبال صاحب کو سب سے زیادہ شغف تدریس سے تھا ۔ ہفتے میں ان کے کلاس گھنٹوں کی غیر معمولی تعداد کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا ۔ اس پر ان کی تیاری اور محنت کا یہ عالم تھا کہ کوئی لیکچر ایسا نہ ہوتا تھا جس کے لیے باقاعدہ یاد داشتیں مرتب نہ کی جاتی ہوں ۔ سبق کے دوران میں سوال و جواب کو پسند نہ کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے سبق کی ترتیب اور روانی میں خلل واقع ہوتا تھا ۔

تدریس میں اس غیر معمولی انہماک کا نتیجہ یہ تھا کہ انھیں یونیورسٹی کے غیر تدریسی ہنگاموں سے کوئی خاص دلبستگی نہ تھی ۔ وہ بہ حیثیت عہدہ مجبوراً ان میں حصہ لیتے تھے مگر یہ ان کے مذاق کی چیز نہ تھی۔ بات یہ تھی کہ ۱۹۲۰ء کے بعد ہندوستان بھر میں ایک خاص قسم کی سیاسی ذہنیت پیدا ہوگئی تھی جس سے تعلیمی ادارے اور درس گاہیں بھی متاثر ہوگئی تھی ۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے ماحول کے سیاسی اثرات سے الگ تھلگ نہ رہ سکتے تھے ۔ اس ہنگامہ آرائی کا نازک ترین مرحلہ انتخابات کا زمانہ ہوتا تھا ۔ انتخابات میں بڑی خوفناک قسم کی فرقہ بندی کارفرما ہوا کرتی تھی ۔ اقبال صاحب ایک مرنج و مرنجان بزرگ تھے ۔ ان کے لیے ان فرقہ بندیوں میں حصہ لینا ابتلائے عظیم سے کم

نہ تھا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب یونیورسٹی کے انتخابات کا زمانہ آتا تھا تو انہیں بڑی پریشانی ہوتی تھی ۔ وہ طبعاً جھوٹ اور ملمع سازی سے نفور تھے اور معرکہ انتخاب وہ بلا ہے جس میں پہلے قدم پر ہی جھوٹ ناگزیر ہو جاتا ہے ۔ کہنے کو تو سب کہتے ہیں کہ انتخابات میں سچ چل سکتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ (پنجابی شاعر بلھے شاہ کے بقول ــ سچ کہندیاں بھانبڑ مچدا اے) انتخابات میں راستی فی الحقیقت رستی فتنہ انگیز بن جاتی ہے ۔ اس سے بڑے بڑے ذاتی اور جماعتی فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ووٹ کا پرزہ بہت سے مصائب کا پیش خیمہ بن جاتا ہے ۔ انتخاب میں اقبال صاحب کو بڑی پریشانی ہوتی تھی مگر اس معاملے میں وہ ملمع سازی سے کام نہ لے سکتے تھے ۔ وہ فرمایا کرتے تھے مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ میں نے اپنے خیال میں موزوں آدمی کو ووٹ دیا ۔ مگر رنج اس بات کا ہے کہ دوسرا امیدوار مجھ سے دل آزردہ ہوا جس کی میں کسی طرح تلافی نہیں کر سکتا ۔ ہر چند کہ بعض لوگ اقبال صاحب کی اس راست بازی کے قدر دان بھی تھے مگر خود انہیں اس کشمکش سے طبعی نفرت تھی ۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کا اصلی منصب یہ ہے کہ علمی تحقیق اور تدریس کے سوا کسی جھگڑے میں نہ الجھائے جائیں ۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق و تدریس کی طرف کم سے کم توجہ کی جا سکتی ہے ۔ سارا وقت غیر تدریسی ہنگاموں میں صرف ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ اس کے بغیر گاڑی آگے چل ہی نہیں سکتی ۔

ایک دفعہ بڑا رنج دہ واقعہ پیش آیا جس کا مجھے مدۃ العمر افسوس رہے گا ۔ ہماری یونیورسٹی میں کلاسیکل زبانوں اور دیسی زبانوں کو یکساں رتبہ دینے کے سوال پر بڑی مدت سے کشمکش چلی آتی تھی ۔ ہماری جماعت (جس میں مولوی محمد شفیع صاحب اور ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب کو رہنما کی حیثیت حاصل تھی) اس رائے کی پابند تھی کہ مشرقی زبانوں یعنی (عربی ، فارسی ، سنسکرت) کو تعلیمات میں دیسی زبانوں (اردو ، ہندی ، پنجابی اور پشتو وغیرہ) سے متبادل نہ بنایا جائے ۔ اس نقطہ نظر میں بہت سی مصلحتیں تھیں جن کی تفصیل اس موقع پر بے محل ہے ۔ ہم لوگوں کو اپنے نقطہ نظر کی صحت کا پورا پورا یقین تھا ۔ اس وجہ سے ہم اس کے متعلق کسی کمزوری کو گوارا نہ کیا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ یہ اعلان ہوا کہ اورینٹل فیکلٹی میں اس مسئلے کا کوئی پہلو زیر بحث آئے گا ۔ اس کے لیے دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے لیے ارکان کی تائید حاصل کرنے کا کام شروع کیا ۔ اس غرض کے لیے عالی جناب شیخ دین محمد صاحب (سابق جج ہائی کورٹ لاہور و گورنر سندھ) کے ایما سے انھی کے مکان پر مشرقی زبانوں کے منتخب مویدین کی مجلس مشاورت ہوئی ۔ اس کے لیے خود شیخ صاحب نے ہی

چند نام تجویز کر دئیر تھے جن میں اقبال صاحب کو بھی شامل کیا گیا ۔ اس اجتماع میں سب مدعوین نے شرکت کی مگر پروفیسر اقبال تشریف نہ لائے یا نہ لا سکے ۔ ان کی غیر حاضری کو حاضرین نے بہت محسوس کیا اور طرح طرح کے سوال اٹھائے گئے جس کا مجھے رنج ہوا ۔ بدگمانی یہ تھی کہ اقبال صاحب کو علوم مشرقیہ کی بقا اور استحکام کے مسئلے کے متعلق اتنی دلچسپی نہیں جتنی بہ حیثیت عہدہ انہیں ہونی چاہیے ۔ ان واقعات کے زیر اثر میں دوسرے دن کالج میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور گزشتہ جلسے کی ساری سرگزشت سنانے کے بعد ان سے ان کی غیر حاضری کی شکایت کی مگر کسی حد تک درشت اور سخت لہجے میں جس سے اقبال صاحب کو بہت صدمہ ہوا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا ''آپ تو میری طبیعت کو اچھی طرح جانتے ہیں ۔ میں اس میدان کا مرد نہیں ۔ مجھے یونیورسٹی کی پالیٹکس سے سخت نفرت ہے۔ میں تو لکھنے پڑھنے کے لیے یونیورسٹی میں آیا تھا۔ اگر مجھے اس سیاست کا علم ہوتا تو میں یہاں آنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچتا ۔'' انہیں اس کا بھی بڑا صدمہ ہوا کہ میں نے اظہار خیال میں غیر معتدل جوش کا اظہار کیا اور ان کی دل خراشی کی ۔

اس واقعہ کا ان پر بڑی مدت تک اثر رہا۔ گو کہ ان کے ظاہری برتاؤ سے ناراضگی کا اظہار نہ ہوتا تھا مگر ان کے ملال کا بعض باتوں سے اندازہ ہو جاتا تھا ۔ میں اس زمانے میں ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ قومی مسائل کے معاملے میں مصلحتوں کا خیال نہیں کرنا چاہیے اور پوری بے خوفی اور خلوص سے کام کرنا چاہیے :

ہزار خوف ہوں لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اس خیال کے زیر اثر میں اکثر کاموں میں مصلحت وقت سے بے نیاز ہو جایا کرتا تھا مگر اس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ بہت سے موقعوں پر مجھ سے جوش کی وجہ سے نازیبا حرکات سرزد ہو جاتی تھیں ۔ اس غلط فہمی میں بعض اوقات حد سے بھی تجاوز کر جاتا تھا جس کی وجہ سے زندگی میں بہت سے نقصان اٹھانے پڑے ۔ اب مدۃ العمر کے تجربے نے یہ بتایا ہے کہ یہ خلوص نہیں بے تدبیری اور نادانی ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے ان ہنگاموں میں میرے بیشتر مشاغل اسی نادانی اور بے تدبیری کے مظاہرات تھے ۔ ان میں شاید سب سے زیادہ ملال انگیز مظاہرہ یہی تھا جس کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے ۔

اس سرگزشت کا نقطۂ تکمیل یہ ہے کہ ابھی اس کشیدگی کی عمر کچھ زیادہ نہ ہوئی تھی کہ ایک صبح سعید کو ۹ بجے کے قریب میں نے دیکھا کہ پروفیسر

اقبال بہ نفس نفیس غریب خانے پر تشریف فرما ہیں :

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

بظاہر گزشتہ واقعہ کے سبب مجھے ان سے اس نیک سلوک کی امید نہ رکھنی چاہیے تھی- اس لیے اس تشریف آوری سے مجھے جتنی خوشی ہوئی اس سے کہیں زیادہ تعجب ہوا - فی الحقیقت پروفیسر صاحب کا یہ اقدام ان کی عالی حوصلگی کا بہت بڑا مظاہرہ تھا - خیر کچھ دیر گفتگو رہی - اس کے بعد گزشتہ واقعہ کا ذکر کیا اور بڑی شفقت سے اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے مجھے زندگی میں معتدل رہنے کی نصیحت کی - اس موقع پر ان کی گفتگو میں محبت اور مہربانی کا جو رنگ تھا اس سے میرا قلب و دماغ اب تک متأثر ہے- یہ ان کی بے اندازہ فیاضی اور کشادہ دلی تھی کہ انھوں نے مجھے معاف فرما دیا اور عذر تقصیر کی نوبت ہی نہ آنے دی - ان کا یہ سلوک مجھ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ یہ ان کا مستقل اور عام مسلک تھا - وہ پہلے تو کسی سے ناراض نہ ہوتے تھے لیکن اگر کبھی خفا ہو جاتے تو معاف کرنے میں زیادہ دیر نہ لگاتے تھے -

مجلسیت اور دوستی کے متعلق اقبال صاحب ایک خاص نظریہ رکھتے تھے - میں نے اپنی زندگی میں اگر کسی شخص کو خواجہ حافظ کے اس قول (با دوستان تلطف با دشمنان مدارا) کا صحیح مصداق پایا ہے تو وہ صرف اقبال صاحب تھے - ان کی مہربانی اور خوش اخلاقی کا دائرہ بہت وسیع تھا- مگر طبعاً وہ "عام اختلاط" آدمی نہ تھے اور عام مجلس آرائی کے بجائے inner circle (مجلس خاص) کے بشدت قائل تھے- وہ دوستانہ اور مخلصانہ جذبات کی وسعت کے ساتھ ساتھ صرف معدودے چند افراد کے ساتھ گہرے اور خصوصی تعلقات رکھ سکتے تھے جن کی صحبت میں انھیں غیر معمولی سکون و آرام ملتا تھا - ان مخصوصین میں پروفیسر آذر اور پروفیسر شیرانی کا نام خاص طور سے لیا جا سکتا ہے - جس زمانے میں آذر صاحب پرانی انارکلی میں رہا کرتے تھے اقبال صاحب نے بھی اسی نواح میں رہائش اختیار کرلی تھی - اس زمانے میں تقریباً ہر شام مجلس انس برپا ہوتی تھی اور بڑی دیر تک جاری رہا کرتی تھی - ان مجالس میں کلام و طعام کے علاوہ چنگ و رباب سے بھی ذوق و سامعہ کی تواضع کی جایا کرتی تھی -

اقبال صاحب افسردہ دل معلوم ہوتے تھے مگر ان کا فلسفۂ حیات نظری لحاظ سے وہی تھا جو خیام اور حافظ کی شاعری میں پایا جاتا ہے - جن لوگوں نے انھیں عمر کے آخری مراحل میں دیکھا ہے انھیں اس سے ضرور تعجب ہوگا - کیونکہ بعد میں اقبال صاحب کا رنگ طبیعت بہت کچھ متغیر ہو چکا تھا- مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کی طبیعت کی اصل افتاد یہ نہ تھی - قیاس یہ کہتا ہے کہ زندگی کے ابتدائی ادوار میں خوش باشی اور چہل پہل کو دوست رکھتے ہوں گے - بعض واقعات کے سبب

آخری دور میں ان کی طبیعت پر افسردگی غالب آ گئی تھی ۔ اکثر دبے دبے رہتے تھے اور عموماً مایوسی اور بے دلی کا اظہار کرتے تھے۔ اس کے اسباب میں دو باتوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے ۔ ایک ان کی بیگم صاحبہ کی بے وقت موت ، دوسری فضا اور ماحول سے عدم مطابقت جس کا مختصر تذکرہ پہلے آ چکا ہے ۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ طبعاً مسرت اور راحت کے شائق تھے ۔ زندگی کے متعلق ان کا نظریہ حکیمانہ تھا ۔ خوش مذاق اور اعلیٰ پسندی ان کی فطرت تھی ۔ وضع کی سادگی کے ساتھ ساتھ شان اور تجمل کو دوست رکھتے تھے ۔ ان کی کسی بات میں معمولی پن نہ پایا جاتا تھا ۔ وہ بلند معیار کو جانتے تھے اور ہمیشہ اس کو قائم رکھنے پر اصرار کیا کرتے تھے ۔

پروفیسر شیرانی ان کے ہم نشین خاص تھے ۔ برسوں جمعے کی شب ماڈل ٹاؤن میں بسر کرنا پروفیسر شیرانی کا معمول ہوگیا تھا ۔ کبھی کبھی داؤد' اور یعقوب' کو همراہ لے کر شکار کو نکل جایا کرتے تھے ۔ اور اگرچہ شکار میں پروفیسر اقبال صاحب کا عملی حصہ بہت کم ہوتا تھا مگر شیرانی صاحب کی رفاقت میں انھیں بڑی راحت ملتی تھی ۔ اس سیر و شکار کے موقعہ پر بڑی پرلطف صحبتیں ہوتی تھیں ۔ ان میں لطائف و ظرائف کے زعفران زار کھل جاتے تھے ۔ شیرانی صاحب کی سادہ بدویانہ ظرافت اور اقبال صاحب کی لطیف نکتہ آفرینی کا یہ اجتماع نہایت دلچسپ ہوتا تھا ۔

پروفیسر اقبال خوش بیان آدمی تھے ۔ شستہ اردو میں سنبھل سنبھل کر بات کیا کرتے تھے ۔ مناسب موقع پر عمدہ فارسی یا اردو اشعار کی آمیزش بھی ہوتی تھی۔ بے تحاشا گفتگو، ان کا شیوہ نہ تھا ۔ چونکہ ایسی گفتگو سے خود بھی تھک جاتے تھے اس لیے دوسروں کو بھی ایسی باتوں سے تھکانا پسند نہ کرتے تھے ۔ بس ، مختصر علمی گفتگو ، برمحل نکتہ آفرینی—مگر اس اختصار کے باوجود ان کے ذوق اور علمیت کا مضبوط نقش مخاطب کے دل پر جم جاتا تھا ۔ چائے میں لپچو یا ''اورینج فلاوری پیکو'' سے بہت رغبت رکھتے تھے ۔ سگریٹ شروع میں بہت پیتے تھے ، بعد میں کم کر دیے تھے مگر جب پیتے تھے تو ''عبداللہ سگریٹ'' کو ترجیح دیا کرتے تھے ۔ ان کے مرغوب سگریٹ کے ساتھ اپنے نام کی شرکت کو دیکھ کر میں نے کئی مرتبہ ان کی طبع لطیف کو چھیڑنے کی جسارت کی ۔ عموماً اس کا جواب صرف خاموشی اور بزرگانہ مسکراہٹ سے دیا کرتے تھے ۔ مگر ایک مرتبہ متبسم زیرلب ہو کر غالب کا یہ شعر پڑھ دیا اور کچھ دیر بڑے مزے سے میری گھبراہٹ کا تماشا دیکھتے رہے :

۱- پروفیسر محمد اقبال صاحب کے سعادت مند فرزند ۔

کم نہیں نازش ہم نامیٔ چشم خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

پروفیسر اقبال فطرتاً خاموش آدمی تھے - پرشور مشاغل اور ہنگاموں سے دور رہتے تھے - مگر ٹھوس علمی کاموں کے سلسلے میں کالج اور یونیورسٹی کی تمام سرگرمیوں میں بڑے جوش سے حصہ لیا کرتے تھے - یونیورسٹی کی انجمن عربی و فارسی کے خازن اور سرگرم رکن کی حیثیت سے انھوں نے مفید خدمات انجام دیں - پروفیسر محمد شفیع صاحب کی پرنسپلی کے زمانے میں کالج کے بہت سے تنظیمی امور انھی کے سپرد تھے- جن کا اہتمام وہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا کرتے تھے - جب خود پرنسپل مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنے مختصر عہد میں اپنی اعلیٰ انتظامی قابلیت کا اچھا ثبوت پیش کیا -

۳۲-۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تحریک اور رہنمائی سے علوم اسلامیہ کی تحقیق و ترویج کے لیے ادارہ معارف اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا جس کا پہلا اجلاس لاہور میں سر محمد اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا - اس زمانے میں مسلمان اہل علم سیاسی لحاظ سے ایک عجیب دور سے گزر رہے تھے - اس زمانے میں مسلمانوں کی اکثر باتیں جوابی ہوا کرتی تھیں - ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تھا - اس کے رد عمل کے طور پر اسلامی علوم و فنون کی ترویج کے لیے ایک مخصوص اسلامی ادارے کی ضرورت محسوس کی گئی - اس کے زیر اثر ادارۂ معارف اسلامیہ وجود میں آیا - تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس کا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا- چنانچہ اس کے دو تین بڑے کامیاب اجلاس ہوئے - اجلاس لاہور میں بہت سے مفید اور عالمانہ مضامین پڑھے گئے - دوسرا اجلاس ۱۹۳۶ء میں پھر لاہور میں اور تیسرا دہلی میں ہوا - یہ سب اجلاس خاصے با رونق اور ہر لحاظ سے کامیاب تھے - ممکن ہے ان اجلاسوں کی کامیابی کے اور اسباب بھی ہوں - مگر ادارے کو اس وقت تنظیمی اعتبار سے جو استحکام نصیب ہوا اس کو میں اقبال صاحب کی خاموش محنت کا کرشمہ خیال کرتا ہوں - اس ادارے کے سیکرٹری کی حیثیت سے انھوں نے اس کی تعمیر و تنظیم کے لیے شب و روز محنت کی اور اجلاسوں کو کامیاب بنانے کے علاوہ ان کی ضخیم رودادیں بھی مرتب کیں -

اس کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ملک بھر کے اہل علم اقبال صاحب سے اخلاص و عقیدت کے تعلقات رکھتے تھے- علاوہ علمی تحریک اور کشش کے اس قسم کے کاموں میں ذاتی روابط اور مراسم بھی مفید ثابت ہوا کرتے ہیں - چنانچہ اقبال صاحب کے ذاتی مراسم اور تعلقات کی وجہ سے ملک کے اہل فضیلت نے ہمیشہ ان کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا - یہ چیز بھی ادارے کے فروغ و ترقی میں

ممد و معاون ثابت ہوئی ۔

پروفیسر اقبال کا علمی اور تحقیقی کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ وہ ایک عالی مرتبہ محقق ، ادیب اور نقاد تھے ۔ اور ملک کے محققین اور مستشرقین کی صف اول میں ان کو نمایاں مقام حاصل تھا ۔ وہ پروفیسر براؤن کے تلامذۂ خاص میں تھے اور شواھد سے یہ ثابت ہے کہ استاد براؤن اپنے اس فاضل شاگرد کی فضیلت سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ''تاریخ ادبیات ایران'' کے حصہ سوم کے دیباچہ میں ان کے علم و فضل کا شایان اعتراف بھی کیا ہے ۔

اقبال صاحب نے انگلستان کے قیام کے دوران میں ''راحۃ الصدور'' کے متن کی تصحیح و اشاعت کا کام انجام دیا ۔ یہ کتاب گب کے یادگاری سلسلے میں شائع ہوئی ۔ ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اخبار الدولۃ السلجوقیہ (عربی) ایڈٹ ہو کر شائع ہوئی : ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے ''ایران بعہد ساسانیان'' کے نام سے ان کی ضخیم مترجم کتاب شائع کی (یہ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے) ۔ وفات سے قبل وہ حکیم سنائی کے متعلقات کی تحقیق میں مصروف تھے اور اپنی معتاد خاموشی کے ساتھ سنائی کی لائف اور تصانیف کے متعلق معلومات جمع کر رہے تھے ۔ اس کے علاوہ سندیلوی کا ضخیم تذکرہ مخزن الغرائب بھی ان کے پیش نظر تھا ۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ اس کے متن کی تصحیح کی جائے اور اگر ممکن ہو تو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیا جائے۔ کچھ اور امور عظیمہ بھی پیش خاطر تھے مگر وہ سرحد خیال سے آگے نہ بڑھ سکے ۔ سیاحت ایران کے بعد ان کا ارادہ یہ تھا کہ فارسی ادب پر ہندیوں کے احسانات کی مفصل سرگزشت مرتب کی جائے جس میں علاوہ شعرا کے ان کی تصانیف کا بھی تذکرہ کیا جائے جو فارسی کے کلاسیکل شعرا کے کلام کی تسہیل و تشریح کے لیے ہندوستان میں مرتب ہوئیں ۔ یہ تحریک شاید اس وجہ سے ہوئی کہ ایران میں ہندوستان کے فارسی مصنفین کی خدمات کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ فارسی میں ہندوستانیوں کا کام کمیت اور قدر و قیمت دونوں اعتبار سے خاصا وقیع ہے ۔ افسوس ہے کہ ان کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی ۔

پروفیسر اقبال کے تحقیقی کام کا دائرہ خاصا وسیع تھا ۔ پنجاب یونیورسٹی میں آنے کے بعد انھوں نے جن مختلف موضوعوں پر قلم اٹھایا ان میں سب سے اہم یہ تھے[1] : ۱ ایران قدیم ، ۲ شاہنامہ ، ۳ خیام ، ۴ خواجہ عماد فقیہہ اور ۵ شعرائے فارسی کے

۱۔ تذکروں پر آن کے مضامین اورینٹل کالج میگزین میں فروری ۱۹۳۰ء کے بعد بالا قساط چھپتے رہے ۔

تذکرے — ان کے متعلق ان کے متعدد مضامین اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوئے۔ شاہنامے سے ان کی دلچسپی کے بڑے محرک پروفیسر شیرانی تھے جن کی شاہنامہ پرستی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شیرانی صاحب کو شاہنامے کے سلسلے میں جو انہاک تھا اس سے ان کا ماحول متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ انھی کے زیر اثر اقبال صاحب نے سلجوقوں کی تاریخ سے ہٹ کر شاہنامہ کو اپنا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے زیادہ تر دوسری زبانوں کے مواد کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کے مضمون تاریخ رزمیات ایران اور شاہنامے[۱] میں طلوع آفتاب وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔

شاہنامے کے برعکس خیام سے اقبال صاحب کی دلچسپی ذاتی تھی۔ اس ریاضی دان شاعر کے طرز فکر اور تصورات میں ان کے لیے طبعاً بھی کشش تھی۔ مگر مغربی اثرات نے اس دلچسپی کو تیز تر کر دیا تھا۔ یورپ کے ماحول نے انھیں حافظ دوست ہونے کی بجائے خیام پرست بنایا۔ زندگی کی بے ثباتی کے احساس کے باوجود لطف زیست اٹھانا خیام و حافظ دونوں میں قدر مشترک ہے مگر حافظ اپنے صوفیانہ رجحانات کی وجہ سے اس جارحانہ مثبت انداز فکر سے محروم ہیں جو خیام کا حصہ ہے۔ خیام کی رنگین مزاجی ایک مثبت رندانہ انداز رکھتی ہے مگر حافظ کی رنگینی صوفیانہ انفعالیت کی آئینہ دار ہے۔ شاید ان دونوں شاعروں میں وہی فرق ہے جو ایک مہذب رند اور رنگین مزاج صوفی میں ہونا چاہیے۔ میں پروفیسر اقبال کی زندگی کے اس دور سے جو انگلستان میں بسر ہوئی بے‌خبر ہوں۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ خیامیت کے کس حد تک قائل تھے۔ مگر حقیقت نگاری مجھے یہ کہنے پر مجبور کر رہی ہے کہ وہ کم از کم نظری اعتبار سے رنگینی کو دل و جان سے مانتے تھے اور اس کو زندگی کی جفاؤں کا علاج تصور کرتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے انھیں خیام کی شاعری اور اس کے پیام سے بڑا انس تھا۔ شعروں کے انتخاب سے دل کا معاملہ یوں بھی کھل جاتا ہے مگر جب انتخاب کرنے والا شعر کو پڑھتے وقت اس کی کیفیتوں سے سرخوش اور سرمست ہو جائے تو دل کا راز طشت از بام ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اقبال صاحب خیام کی رنگین رباعیات کو ایسے وجد و ذوق سے دھرایا کرتے تھے کہ سننے والے پر سر خوشی کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ غالباً اسی شیفتگی نے انھیں خیام کے گہرے علمی مطالعہ کی طرف متوجہ کیا۔

لاہور میں خیام کی تحقیق و مطالعہ کی تحریک کو اس نزاع سے بھی بڑی تقویت حاصل ہوئی جو فضلائے لاہور اور علمائے دارالمصنفین کے مابین ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیانی عشرے میں برپا تھی۔ یہ وہی نزاع تھی جس سے شیرانی صاحب کی

۱۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۲ء فروری ۱۹۳۳ء۔ شاہنامے کے ماخذ — فروری ۱۹۲۵ء شاہنامے کا جغرافیہ۔ اگست ۱۹۲۶ء۔

تالیف تنقید شعر العجم وجود میں آئی - پروفیسر اقبال اگرچہ ثالث بالخیر بزرگ تھے اور اس قسم کے منازعات سے دور رہا کرتے تھے مگر اس معاملے میں پروفیسر شیرانی کے اثر سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ اس علمی مناظرے میں ان کو بھی شریک ہونا پڑا - اس زمانے کی یادگار ان کا وہ مضمون ہے جو خیام پر رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا - اس نزاع میں ان کی شرکت کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ علامہ شبلی نے پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کو واقعات کی ''کھتونی'' کے حقارت آمیز لقب سے یاد کیا تھا اور یہ رائے اقبال صاحب کے خیال میں بڑی حد تک غیر منصفانہ تھی - شبلی کے اس طنز نے پروفیسر اقبال کو بھی میدان جنگ میں اکلنے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ وہ ان بحثوں سے دامن بچانے کی کوشش کیا کرتے تھے - شاید اس مضمون کے ماسوا ان کا کوئی دوسرا مضمون مناظرانہ اور ''جنگ جویانہ'' نہیں -

رباعیات خیام کے متعلق ان کا ایک اور محققانہ مضمون اوریئنٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۲۶ء) میں شائع ہوا جس کا عنوان ہے ''رباعیات خیام کا ایک قدیم نسخہ''— اس کی بنیاد اس مخطوطے پر ہے جو خواجہ محمد سلیم (کوٹھی داران لاہور) کے کتب خانے میں تھا - یہ بظاہر انڈیا آفس کے نسخے کے بعد سب سے پرانا نسخہ تھا اور شاید رباعیات کی سب سے کم تعداد اسی میں تھی - اس کے بعد انھوں نے ۱۹۳۴ء میں خیام کے نوروز نامہ پر ایک مقالہ[1] اوریئنٹل کالج میگزین میں شائع کیا۔

ان کے مضامین کا دوسرا سلسلہ خواجہ عماد فقیہ کے متعلق ہے - اس پر کام کرنے کا خیال انھیں شاید عماد کے اس قیمتی مخطوطے سے پیدا ہوا ہوگا جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے - اس سلسلے میں انھوں نے ایک مضمون بہ عنوان ''خواجہ عماد اور حافظ کی متحد البحر غزلیں'' اوریئنٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۲۹ء) میں شائع کیا - عماد کی مثنوی صفا نامہ کا متن بھی اس میگزین میں بالاقساط شائع ہوتا رہا -

ان خاص موضوعوں کے علاوہ انھوں نے چند اور مضامین کی طرف بھی توجہ کی جن کی تفصیل حاشیے میں درج کی جاتی ہے[2]۔

۱- اوریئنٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۴ء - ۲- ان کے بعض اور مضامین یہ ہیں:
فارسی کی بعض شاعر عورتیں اور ان کا کلام (اوریئنٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۳ء - فروری ۱۹۳۴ء) -
علامہ ابن الفوطی (ایضاً مئی ۱۹۳۵ء) - تذکرہ خاقانی (ایضاً اگست ۱۹۳۶ء - نومبر ایضاً) امام موفق (ایضاً فروری ۱۹۳۷ء) جہانگیر اور نورجہان کی منظوم داستان عشق ایضاً نومبر ۱۹۳۸ء - بحر الفوائد - ایضاً نومبر ۱۹۳۷ء الحوادث الجامعہ فی مائۃ السابعہ ایضاً فروری ۱۹۳۸ء مجمع النوادر ایضاً اگست ۱۹۳۹ء - (بقیہ مضامین کے لیے ملاحظہ ہو اوریئنٹل کالج میگزین مئی ۱۹۴۲ء فہارس) -

مضامین کی اس فہرست سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال صاحب کا علمی اور تحقیقی کام بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ انھوں نے فارسی ادب کے بڑے اہم موضوعوں پر قلم اٹھایا اور ان میں اپنی تحقیق اور کاوش سے بہت سے مجتہدانہ اضافے کیے۔ ان کے کام کی ضخامت خاصی ہے مگر اس کی علمی اہمیت اور حیثیت اس سے بدرجہا زیادہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت محقق ان کا رتبہ اور مقام بڑا وقیع اور بلند ہے۔

اس سلسلے میں یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ طبعاً اور اصولاً وہ محقق سے کہیں زیادہ ایک ادیب تھے۔ میں نے بیس سال کی مدت میں ان کے طبعی رجحانات اور صلاحیتوں کا جو اندازہ لگایا ہے اس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ تحقیقی تتبع اور چھان بین کے مقابلے میں ان کا ذہن تخیل کا زیادہ دلدادہ تھا۔ خشک منطقیت سے ان کو بہت کم لگاؤ تھا اور معین منطقی حقائق کے بیان کی بجائے وہ لچک دار اظہار و بیان سے زیادہ رغبت رکھتے تھے۔ ان کے ذہن کو تاریخ سے بھی طبعی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ادب کے اور صرف ادب کے آدمی تھے۔ اور شاید اسی میدان میں ان کی بے نظیر صلاحیتوں کو اپنا اصلی جوہر دکھانےکا زیادہ موقعہ ملتا۔ مگر ماحول اور زمانے کی چیرہ دستی ایک مانی ہوئی بات ہے جو شبلی کو شاعر کی بجائے سوانح نگار بنا دیتی ہے اور آزاد کو افسانہ نویس کی بجائے مورخ بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔

تنقید میں اقبال صاحب اپنے فاضل دوست اور رفیق کار پروفیسر شیرانی سے الگ مذاق رکھتے تھے۔ شیرانی صاحب اپنی تنقید میں واقعاتی صداقت کی تعیین پر اصرار کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی عام تنقیدوں کا ماحصل یہ ہے کہ چند مشہور اور زبان زد عام واقعات اصل اور مستند شواہد کی روشنی میں تاریخی اعتبار سے درست نہیں۔ اس صداقت تک پہنچنا ایک مؤرخ کا نصب العین ہے۔ پروفیسر شیرانی اصولاً ایک مؤرخ تھے۔ ان کی نظر وسیع بھی تھی اور تیز بھی۔ وہ واقعات کے انبار میں سے غلط اور صحیح کو اپنی وسعت مطالعہ کے بل پر الگ الگ کرکے دکھا سکتے تھے۔ وہ تاریخی غلطیوں کو سونگھ لیتے تھے۔ جس طرح ایک جوہری موتیوں کے آب و رنگ سے ان کی اصلیت کا راز معلوم کر لیتا ہے اسی طرح پروفیسر شیرانی کتابوں کی عبارتوں اور فقروں سے ان کے صحیح النسب ہونے کا حال پا لیتے تھے۔ انھوں نے اس معاملے میں وہ وہ کارہائے نمایاں انجام دے ہیں جن کو زمانے کا کوئی محقق نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مگر تنقید صرف اسی چیز کا نام نہیں۔ تنقید اس کے علاوہ اور اس سے ماورا بھی بہت کچھ ہے۔ تنقید کا شاید سب سے بڑا کام کسی ادب پارے کی حقیقی قدر و قیمت کی دریافت ہے—اور اگر وہ ادب پارہ سچ مچ ایک اہم ادبی تخلیق ہے تو اس کی قدر و قیمت کی دریافت کی بنیاد اس اہم سوال پر

قائم ہے کہ اس کی جالیاتی قدریں کیا ہیں ؟ پروفیسر شیرانی نے تنقید کے اس رخ پر عموماً نظر نہیں ڈالی ۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر شیرانی کی تنقید کے باوجود شعر العجم کی اصلی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی ۔ شعر العجم بذات خود ایک تخلیق ہے ۔ تنقید کے اس پہلو کو جس پر شبلی نے خاص نظر ڈالی ہے پروفیسر شیرانی نے نظر انداز کر دیا ہے ۔ اقبال صاحب کی تنقید کا انداز یہ ہے کہ وہ ادب میں حسن و جمال کے عناصر کی جستجو کرتے ہیں ۔ واقعات یا تاریخی نظریات کے صحیح غلط ہونے کی جستجو سے ان کو طبعی شغف نہ تھا ۔ ان کے اعصاب اور ان کی صلاحیتیں منطقی صداقتوں کی تلاش کی زحمت کی تاب نہ لا سکتی تھیں ۔ وہ ادب کے مزاج شناس اور رموز حسن کے نباض تھے اور اس کام کے لیے جس ذوق و نظر کی ضرورت ہوتی ہے اس سے وہ خاص طور سے بہرہ مند تھے ۔

اس نقطۂ نظر سے ان کا بہترین مضمون ''شعر العجم پر ایک نظر'' ہے جو عمر کے آخری دور میں یوم شبلی کے موقعہ پر انھوں نے لاہور میں پڑھا تھا ۔ (اور بعد میں ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا) اس مقالے میں انھوں نے شعر العجم کے جس وصف کی سب سے زیادہ تعریف کی ہے وہ اس کے مصنف کا حسن ذوق اور حسن انتخاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ مقالہ مضمون نگار کی اپنی خوش مذاقی اور ذوق حسن کا بھی ایک زندہ ثبوت ہے ۔

اقبال صاحب کا طرز بیان ان کی سیرت کے نقوش کا حامل ہے ۔ خوش وضع اور سادہ ، ان کا اسلوب ان کے طرز زندگی سے ہم آہنگ ہے ۔ ان کی تحریر میں سادگی کے باوجود سج دھج بھی ہے اور ایک خاص قسم کا حسن بھی پایا جاتا ہے ۔ وہ خوبصورت الفاظ کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے اور بھاری بھر کم لفظوں اور ترکیبوں سے اجتناب کرتے تھے ۔ نفاست کا بڑا لحاظ رہتا تھا ۔ گفتگو کی طرح عبارت میں بھی سکون اور وقار کا رنگ قائم رکھتے تھے ۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں جوش اور جذباتی مد و جزر کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا ۔ اس کے علاوہ جیسی تحریر تھی ویسا ہی طریق املا تھا ۔ الگ الگ کھلا کھلا خط ۔ لفظوں کے درمیان مناسب فاصلے ۔ ٹھہراؤ اور سکون ہر ہر سطر سے ظاہر ہوتا تھا ۔ عجلت اور تیزی و تندی کے عیب سے پاک—اردو انگریزی دونوں میں یہی وضع تھی—ان کے خط کو دیکھ کر ان کی شخصیت کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ۔

ان کی عبارتوں کی فضا گھٹی گھٹی نہ ہوتی تھی ۔ ان کو پڑھ کر طبیعت کھل جاتی تھی اور ذہن کو ایک خاص قسم کا سکون میسر آتا تھا ۔ نجی خطوط بھی اسی طرح کے ہوتے تھے ۔ ان میں بے اندازہ انکسار کا اظہار کرتے تھے ۔ ان کے مکاتیب میں انسانی ہمدردی کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے ۔ وہ انگریزی کے مقابلے میں اردو میں خط لکھنے کو ترجیح دیتے تھے ۔ انھوں نے اردو کی حمایت اس زمانے میں

کی جب انگریزی ہندوستان میں الہامی زبان سے کم نہ سمجھی جاتی تھی ـ مگر انگریزی لکھتے خوب تھے اور بولنے کی ضرورت پڑتی تو بڑی فصیح انگریزی میں اظہار خیال کر سکتے تھے ـ

یہ تھے اقبال صاحب جن کے مشفقانہ سایے میں میں نے عمر عزیز کے کم و بیش پچیس سال بسر کیے ـ اس طویل مدت میں میں نے ان کی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے اور ان کی شخصیت کے بہت سے گوشوں پر قریب سے نظر ڈالنے کا موقع پایا ـ ان کے مدرسانہ طریقوں کا غائر مطالعہ کیا ـ ان کی تحقیق و تدقیق کے سارے انداز نظر سے گزرے اور ان کی تنظیمی قابلیتوں کو پرکھا اور تولا ـ اس طویل تعلق اور مشاہدے کی بنا پر میری رائے یہ ہے کہ وہ یگانۂ عصر اور یکتائے روزگار تھے ـ ان کی ذات میں جو خوبیاں جمع ہوگئی تھیں وہ خوبیاں انفراداً بھی بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں ـ وسعت علم اور وجاہت ، ملکۂ تنظیم اور صلاحیت تعمیر ، مادۂ تحقیق اور قوت تنقید ، خوبیٔ تقریر اور رنگینیٔ تحریر—! ، ان سب خصائص کے اجتماع سے جو شخصیت وجود میں آئی تھی اس کا نام اقبال تھا ـ مگر ان صفات کے علاوہ اس با اقبال ہستی کی ایک خصوصیات ایسی بھی تھی جو ان سب سے نمایاں تر اور ممتاز تر تھی—یہ وہ صفت تھی جس کا نقش سب سے زیادہ شوخ، سب سے زیادہ دلکش تھا ـ یہ وہ خوبی تھی جو ان کی سب خوبیوں کو اجاگر کر دیتی تھی اور ان کی ذات کو ایک محبوب ذات بنا دیتی تھی—یہ تھی ان کی بے نظیر شرافت اور بے مثال انسانیت !

مطبوعات ادارۂ تالیف و ترجمہ پنجاب یونورسٹی ، لاہور

۱- اصطلاحات معاشیات	۱۰/-
۲- اصطلاحات نفسیات	۱۰/-
۳- اصطلاحات اطلاقی نفسیات	۱۰/-
۴- اضافیت کا نظریہ خصوصی ، از جناب خالد لطیف میر	۱۶/-
۵- سوئی گیس اور اس کا مصرف ، ڈاکٹر محمد نذیر رومانی	۱۵/-
۶- ہم ربطی کیمیا ، ڈاکٹر محمد ظفر اقبال ، ڈاکٹر نصیر احمد	۱۰/-
۷- فولاد سازی ، ڈاکٹر فضل کریم و آئی ایچ خاں	۱۸/-
۸- نظریہ گروپ ، از جناب عبدالحمید	۱۴/-
۹- لسونت مادے ، از ڈاکٹر ایم ۔ اے عظیم	۳/۵۰
۱۰- جبذ ، از ڈاکٹر ایم ۔ اے عظیم	۳/۵۰
۱۱- ایٹم کی ساخت ، از ڈاکٹر شفیق حسین	۱۲/-
۱۲- شماریاتی میکانیات ، از ڈاکٹر عبدالبصر پال	۱۰/-
۱۳- مرکزائی کیمیا ، از ڈاکٹر ظفر اقبال	۱۵/-
۱۴- فونڈری ٹیکنالوجی ، از ڈاکٹر فضل کریم	۴۵/-
۱۵- مرکزائی اشعاع اور زراعت میں ان کی اہمیت ، از ڈاکٹر احمد سعید بھٹی	۱۰/-
۱۶- تجاذب اور سیاروی حرکت ، از ڈاکٹر عبدالبصیر پال	۱۲/-
۱۷- صنعتی معاشریات ، از پروفیسر ڈاکٹر سی اے قادر	۱۰/-
۱۸- قاموس نباتیات ، از جناب وہاب اختر عزیز	۱۵/-
۱۹- علم افزائش آبادی کے تکنیکی پیمانے ، از جناب مظہر حسین	۱۲/-
۲۰- کیمیائی بند و ساخت ، از ڈاکٹر محمد ظفر اقبال	۱۴/-
۲۱- ویکٹر اور ٹینسر ، جناب خالد لطیف میر	۲۵/-
۲۲- پاکستان کی معدنی دولت ، از جناب ذوالفقار احمد	۲۲/-
۲۳- دھاتیں اور ان کے استعمالات ، از ڈاکٹر فضل کریم	۴۵/-

ملنے کا پتہ :

سیلز ڈپو ، پنجاب یونیورسٹی ، اولڈ کیمپس ، لاہور

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

پروفیسر مولوی محمد شفیع

پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب سے بلاواسطہ اکتساب فیض کا موقع مجھے بہت کم میسر آیا - ایک تو اس لیے کہ مولوی صاحب کی بارگاہ تک رسائی ہی بہت مشکل مرحلہ تھا - دوسرے جب یہ مرحلہ دشوار ذرا آسان ہوا تو مولوی صاحب داغ مفارقت دے کر علم و تحقیق کی انجانی وادیوں کی طرف نکل گئے !

قیام پاکستان کے بعد جب ہم ہجرت کرکے لاہور آئے اور دشت سیاست سے نکل کر علمی پیاس بجھانے کے لیے خیابان ادب کا رخ کیا تو اوریئنٹل کالج میں بھی آنا جانا شروع ہوا - لاہور کی اس قدیم درس گاہ کی خاموش اور پرسکون فضا میں جو آج کل کے شور و شر سے بالکل مختلف تھی چند ہستیوں سے روشناس ہوا - ان میں کوئی مشرقی وضع میں شیروانی یا جبہ پہنے و دستار باندھے نظر آئی ، کوئی مغربی لباس میں ملبوس لیکن اپنے اپنے کام ، درس و تحقیق میں منہمک - لیکن ان سب سے جدا ایک ہستی ایسی بھی دیکھی جو اپنے قد و قامت اور حلیے و لباس سے الگ تھلگ اور بلند و بالا ، خاموش لیکن پروقار ، بلکہ پر ہیبت ، پینسٹھ سال سے اوپر عمر ، دراز قد ، صحت مند جسم ، بھرا ہوا چہرہ، گندمی و سرخ و سپید رنگت، دھاڑی صفا چٹ ، مائل بہ سفیدی گھنی مونچھیں ، چمکدار آنکھیں ، سفید شلوار اور سیاہ شیروانی پہنے اور پھندنے دار ترکی ٹوپی زیب سر کیے ایک عجب شان تمکت کے ساتھ چلتے ہوئے نظر آ جاتی - اس کوہ ہمالہ کو دور سے دیکھنے کا اتفاق کبھی کبھی ہوتا تھا - قریب جانے کا کوئی موقعہ نہ ملا اور نہ ہی حوصلہ ہوا - پھر یہی سہیب شخصیت کچھ دنوں کے بعد کالج کی بجائے یونیورسٹی لائبریری کے ایک گوشے کے آس پاس جہاں اب ادارۂ تالیف و ترجمہ اور یونیورسٹی پریس ہے ، نظر آنے لگی - سردیوں میں باہر ہری ہری گھاس پر دھوپ چھاتے کے نیچے کتابوں اور مسودوں کے انبار کے درمیان مسلسل کام میں مصروف اور نماز کے وقت جامع نیلا گنبد میں خضوع و خشوع سے عبادت میں مشغول - نماز کی نماز ، تفریح کی تفریح - اس معمول میں نہ کوئی ناغہ ہوتا نہ فرق پڑتا - سوائے ان ایام کے جب یونیورسٹی بوجہ تعطیل بند ہوتی - یہ تھے خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع المعروف بہ مولوی صاحب ، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے چیئرمین و مدیر اعلیٰ ، اپنے مختصر عملے کے ساتھ اس عظیم منصوبے کے ابتدائی مرحلوں سے نبرد آزما - میں نے گرد و پیش دیکھا تو مرعوبیت کی یہ کیفیت کچھ میرے ہی حصے میں نہیں آئی تھی بلکہ

جس کو دیکھا اس کو لرزاں و ترساں دیکھا ۔ سوچا عجیب شخص ہے کہ اس کے ہر طرف سنگلاخ چٹانیں اور پہاڑ سی دیواریں حائل ہیں ۔ اس میں کوئی دلنوازی نہیں ، کوئی رنگینی و لطافت نہیں ، کوئی جاذبیت نہیں ۔ بہت قریب کے لوگوں کو دیکھا تو وہ بھی اتنے ہی دور پائے گئے ۔ نہ کسی میں قریب ہونے کی خواہش دیکھی ، نہ ملاقات کرنے کا حوصلہ پایا ، جسے ان سے کسی کام کے سلسلے میں ملنا پڑا ، وہ بھی بعد میں کچھ سراسیمہ و پریشان ہی دیکھا گیا :

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

جب یہ حال ہو خواص کا ، تو ہم جیسے عوام بھلا کس شمار و قطار میں ہو سکتے ہیں ۔ اس لیے احتراماً دور ہی سے دیکھا کیے ۔ لیکن اس دور بینی کے باوجود ان کو جاننے کا شوق بھی کچھ لاشعوری طور پر بڑھتا گیا ۔ اورینٹل کالج کے واسطے سے ان کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوتا تھا وہ ناکافی ہونے کے علاوہ حوصلہ شکن بھی تھا ۔ وہ ۱۹۱۹ء میں کیمبرج سے آئے اور پروفیسر عربی ہو گئے ۔ پھر پروفیسر وولنر کے زمانے میں وائس پرنسپل اور اُن کی وفات (جنوری ۱۹۳۶ء) کے بعد ۱۹۴۲ء تک پرنسپل اورینٹل کالج رہے ۔ اس وقت مرحوم اورینٹل کالج زندہ تھا اور اس کے پرنسپل کا بڑا مرتبہ تھا ۔ مولوی صاحب بڑے رعب داب کے پرنسپل تھے۔ اُن کی سخت ضابطہ پسندی، طلبہ و اساتذہ سے روکھا سوکھا برتاؤ، بلکہ سخت گیری کے افسانے زبان زد عام پائے۔* یہ بھی سنا کہ وہ اپنی پرنسپل شپ کے زمانے میں یونیورسٹی کے بڑے بڑے افسروں کو اپنے دفتر کے دروازے

---

*ایک واقعہ سنا ہے ، آپ بھی سن لیجیے :

مولوی صاحب ایک دفعہ مولوی فاضل کی کلاس کو پڑھا رہے تھے ۔ اُس زمانے میں عربی زبان و ادب کے علاوہ مولوی فاضل و عالم کے طلبہ کو کچھ جنرل نالج بھی پڑھایا جاتا تھا ۔ ان کلاسوں میں طلبہ کے لیے عمر کی کوئی قید تو تھی نہیں ۔ چنانچہ کلاس میں ایک سفید ریش بزرگ طالب علم بھی پچھلی بنچ پر بیٹھے اطلبوالعلم کا شوق پورا کر رہے تھے ۔ مولوی صاحب نے جزیرۃ العرب کا تاریخ ، جغرافیہ پڑھاتے پڑھاتے اُس بزرگ طالب علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہ لڑکا بتائے ، نقشے پر یثرب کہاں ہے؟“ وہ بزرگ سفید ریش خاموش بیٹھا رہا یہ سمجھ کر کہ شاید روئے سخن کسی دوسرے طالب علم کی طرف ہے ۔ مولوی صاحب کو ذرا جلال آ گیا اور قدرے ترشی سے نشاندہی کرتے ہوئے دوبارہ سوال دوہرایا ”وہ آخری بنچ والا لڑکا بتائے کہ نقشے پر یثرب کہاں ہے؟“ وہ بزرگ حیران پریشان کھڑا ہوا ، اور پوچھا ”جی ، کیا میں لڑکا ہوں“ ۔ مولوی صاحب نے فرمایا : ”ہاں ، تم لڑکے ہو ! جب تک اس بنچ پر بیٹھو گے لڑکے ہی رہو گے !“ اور وہ سفید ریش بزرگ طالب علم جھینپ کر رہ گیا !